**صفدر رشید**

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

# ترجمے کی تنقید کے اصول (خصوصی حوالہ کیتھرنہ ریس)

**Abstract:**

Though we are always judgmental about every type of translation, but irony is that we are least concerned about the parameters of judging a translated work. It has almost become a subjective activity. Translations have traditionally been judged on the bases of grammar, idiom, culture, content, style, etc. Judging the quality of a translation is not merely an evaluation and a subjective activity. There must be objective rules for different types of texts. The term 'Translation Criticism' is not older than three decades in the West. Katharina Reiss' book is groundbreaking in this regard, that was translated in English in 2000. The present article stresses the need to adopt the principles of translation criticism. It also discusses the different categories of texts presented by Katharina Reiss.

**Key Word:** Judgmental, Grammar, Idiom, Culture

ترجمے کی اہمیت اس حد تک مسلمہ ہے کہ اس پر بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ اگر ایک جملے میں کہا جائے تو تراجم کا سب سے بڑا فائدہ کسی ایک زبان کے تصورات اور اسالیب کو کسی دوسری زبان میں کسی نہ کسی درجے میں منتقل کرنا ہے۔ اپنی تمام تر افادیت اور ناگزیریت کے باوجود ہر ترجمہ بہت حد تک ایک سمجھوتہ ہوتا ہے کیونکہ مترجمہ متن ایک علیحدہ وجود ہے، جو اپنا تناظر رکھتا ہے۔

ہر قسم کے متن کے جائزے کے لیے علیحدہ طریقہ کار درکار ہے۔ آئے دن ہم تراجم کے جائزے دیکھتے ہیں، مگر کیا انھیں تراجم کی تنقید کے ذمرے میں رکھا جا سکتا ہے؟ تراجم کے جائزے کے ضمن میں چلت قسم کے جملے سامنے آتے ہیں کہ: نہایت عمدہ اور رواں ترجمہ ہے؛ ترجمہ بہت ذمہ داری سے کیا گیا ہے؛ اگر مصنف اس زبان میں لکھتا تو ایسا ہی لکھتا؛ ترجمہ محسوس ہی نہیں ہوتا، اصل کا گمان ہوتا ہے، وغیرہ۔ مترجم کے علم و فضل پر بات کی جاتی ہے اور پھر اصل متن یعنی ماخذی زبان کا متن زیر بحث آجاتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ماخذی زبان کے

متن کو دیکھے بغیر راءے دے دی جاتی ہے۔ بعض اوقات تبصرہ نگار ایسے ترجمے پر بھی بات کر جاتا ہے جس کی ماخذی زبان سے وہ ناآشنا یا نہایت کم آشنا ہے۔ ہمارا مجموعی تنقیدی رویہ بھی یہی ہے کہ تاثراتی اور عمومی راءے دینے پر اکتفا کرتے ہیں، جس کا اطلاق بہت سے فن کاروں یا فن پاروں پر ہو سکتا ہے۔ تنقید کا ایک بنیادی وظیفہ متن یا فن پارے کی تعین قدر ہے۔

ترجمے کا عمل خواہ کس قدر ہی تکلیف دہ اور صبر آزما کیوں نہ ہو، اس کا حقیقی جاءزہ لینا زیادہ دقت طلب ہے۔ ترجمے کی تنقید پر ہمارے ہاں ابھی بات کا آغاز نہیں ہوا۔ مغرب میں بھی اس موضوع پر بات قریباً دو تین دہاءیاں قبل ہی شروع ہوءی ہے۔ بڑی تعداد میں تراجم کا سامنے آنا بہت پرانا مظہر بھی نہیں ہے، یوں ۹۰ کی دہاءی میں مغرب میں اس موضوع کا سامنے آنا زیادہ حیران کن امر نہیں ہونا چاہیے۔

ترجمے کی تنقید ادبی تنقید سے ایک جدا مظہر ہے، تاہم یہ بھی درست ہے کہ ایک اچھا ادبی نقاد ہی ترجمے پر اچھی تنقید کرنے کا اہل ہے۔ تبصرے اور تنقید میں فرق روا رکھا جانا ضروری ہے۔ تبصرہ ایک ہلکی پھلکی شے ہے، جس میں تاثرات کا غلبہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر تراجم کے جاءزے تبصرے کی ذیل میں آتے ہیں۔ تبصرہ نگار کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ماخذی اور ہدفی زبان کے متون کا تفصیلی تقابلی موازنہ کرءے جب کہ ترجمے کے نقاد سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ چند ایسے سوالات ہیں جن پر ترجمے کے نقاد کو بہت واضح ہونا چاہیے۔ ان سوالوں سے نبٹنے کی نوعت اس کی تنقید کو متاثر کرے گی۔ ذیل میں چند سوالوں کی نشان دہی کی جا رہی ہے:

سوال یہ ہے کہ صرف ترجمے کی بنیاد پر مصنف کے نقطہ نظر یا اس کے فن پر بات کس حد تک کی جا سکتی ہے؟ ہم تک اصل متن دو چھلنیوں، یعنی مترجم کی ذات اور ہدفی زبان، سے چھن پر پہنچتا ہے، لہذا اسے کس حد تک مصنف کے خیالات یا اس کا فن کہا جا سکتا ہے؟ مترجمہ متن کو سامنے رکھتے ہوءے اور اصل متن کو نظر انداز کر کے اسلوب اور جمالیاتی قدروں پر بات کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عمومی قسم کی باتیں دہرا دی جاتی ہیں۔

تنقید ترجمہ کا بنیادی سروکار دونوں متنون کے موازنے سے ہے اور یہ اسی صورت ممکن ہے جب ترجمے کا نقاد دونوں زبانوں پر قدرت رکھتا ہو۔ عموماً ہدفی زبان میں تو مہارت ہوتی ہے، مسءلہ ماخذی زبان کا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ماخذی متن کی زبان، ثقافت اور متن کی مخصوص نوعیت یا صنف کے ساتھ مناسبت بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

مترجمہ متن کی جانچ کرتے ہوئے یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ اصل متن نہیں ہے، لہذا اصل متن کی ادبی خصوصیات، اسلوب، تخیل، احساسات وغیرہ ایک حد تک ہی ترجمے میں آسکتے ہیں۔

پیچیدہ اور گنجلک جملوں کا ترجمہ کرتے ہوئے ماخذی زبان کے اسلوب کو کس حد تک برقرار رکھا جائے، یہ ایک بہت اہم سوال ہے۔ یہ بات غیر منطقی ہے کہ ہر زبان ہر طرح کا خیال ادا کرنے کی اہل ہے۔ ہر زبان کی اپنی حدود ہیں، اچھا مترجم اور نقاد ان حدود کو مد نظر رکھتا ہے اور ناجاءز توقعات نہیں پالتا۔ محمد حسن عسکری "مادام بواری" کے ترجمے کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "۔۔۔ لیکن اگر کوئی صاحب پروست کا ایک جملہ اردو میں ٹھیک ترجمہ کر کے دکھائیں تو میں اردو کو دنیا کی سب سے بڑی زبان مان لوں گا۔۔۔ آپ کہیں گے کہ اردو میں ابھی اتنے پیچیدہ اور گنجلک جملوں کو سہارنے کی اہلیت نہیں پیدا ہوئی۔ سیدھے سادے جملوں ہی کا معاملہ لیجیے۔ یوں کرنے کو تو میں نے "مادام بواری" کا ترجمہ کر دیا ہے۔ لیکن اس ناول میں ایک ٹکڑا ہے، جس میں ہیروئین کی چھتری پر برف گرنے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ اگر اردو کے سارے ادیب مل کر ان آٹھ دس سطروں کو اس طرح ترجمہ کر دیں کہ اصل کا حسن ویسا کا ویسا ہی رہے تو اس دن سے میں اردو کے علاوہ کسی اور زبان کی کتاب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"(۱)

یہ دقت اپنی جگہ مگر عسکری کی بات سے مکمل اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہر زبان میں ایسے خیالات اور مصنف کے گنجلک خیالات ہو سکتے ہیں جنھیں کسی بھی دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔

اہم سوال یہ ہے کیا ترجمے کو معروضی انداز میں جانچا جا سکتا ہے؟ جس طرح ادبی تنقید خالصتاً معروضی نہیں ہو سکتی، اسی طرح ترجمے کی تنقید بھی مکمل طور پر معروضی نہیں ہو سکتی۔ تاہم ادبی تنقید کی نسبت یہاں معروضیت کے امکانات زیادہ ضرور ہیں۔

کیا ترجمے کا نقاد ترجمے میں اصلاح بھی تجویز کرے گا یا محض کوتاہیوں اور تسامحات کی نشان دہی پر اکتفا کرے گا؟ اعلیٰ چیز یہی ہے کہ مترجم کی کوتاہیوں کی نشان دہی کے ساتھ تجاویز و اصلاحات بھی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتانے کی کوشش کی جانی چاہیے کہ مترجم نے اس غلطی کا ارتکاب کیوں کیا، مثلاً ممکنہ وجوہات یہ ہو سکتی ہیں: مترجم کو ماخذی زبان یا ہدفی زبان کے محاورے پر قدرت نہیں؛ مترجم نے لغت کا مناسب استعمال نہیں کیا؛ لفظ کو غلط فہمی سے کچھ اور سمجھا؛ مترجم تساہل پسند ہے یا لفظ اور جملوں کی گہراءی میں جایا جا سکتا تھا وغیرہ۔

ترجمے کے بارے میں قاری/نقاد کی توقعات بھی ترجمے کی تنقید کو متاثر کرتی ہے۔ نقاد کے ذہن میں جیسے پیمانے ہوں گے، ویسے ہی وہ انھیں اپنے جاءزے یا تنقید میں برتے گا، مثلاً اگر نقطہ نظر یہ ہے کہ ادبی متن کا ترجمہ ممکن ہی نہیں تو زیادہ سے زیادہ ایک اچھی جانچ ہی ممکن ہے تنقید نہیں۔ جانچ ایک اکیڈمک نوعیت کی چیز ہے۔ تجزیے اور جانچ کو نیم تنقید کہا جاسکتا ہے۔ اگر توقع یہ ہے کہ اسلوب سادہ ہو اور ابلاغ ہو جائے تو اس کا مطلب ہے کہ ہدفی متن کو زیادہ اہمیت دی جارہی ہے۔ اگر توقع ماخذی زبان کے اسلوب کو بھی ہدفی زبان کے مزاج کے اعتبار سے منتقل کرنے کی ہے تو تقاضے جدا ہوں گے۔

ادبی متن کے اسلوب یا طرز تحریر کو ایک مترجم کس طرح اپنے ترجمے میں سمو سکتا ہے؟ یہ بہت بڑا چیلنج ہے۔ سوال یہ بھی ہے کہ اسلوب کو معنی کا حصہ کس حد تک سمجھنا ہے؟ حتیٰ کہ لفظ کا محل وقوع بھی معنی خیزی میں اہمیت رکھتا ہے، خصوصاً شعری متن میں۔ صاحبِ طرز ادیبوں کی نثر کا بھی یہی حال ہے، مثلاً یوسفی کے اسلوب اور مواد کو کیونکر جدا کیا جاسکتا ہے؟ ترجمے میں یہ چیز کس حد تک منتقل ہو یہ پیمانے بہت حد تک ترجمے کے نقاد کے پاس ہونے چاہییں۔ عام طور پر ترجمے میں روانی کا بہت تذکرہ ہوتا ہے۔ کیا روانی یا متن کی سہولت سے پڑھت ترجمے کی لازمی خوبی ہے؟ کیا ترجمے کی روانی اصل متن کی زبان کی روانی کے مطابق ہے؟ کیا روانی ہر طرح کے متن کے لیے ناگزیر ہے؟ ترجمے کی تنقید کے دائرے میں ایسے بہت سے سوالوں سے نبٹنا ہوگا۔

قاری کے سامنے اصل متن نہیں ہوتا اور اکثر اوقات وہ ماخذی زبان سے ناآشنا بھی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مترجم نے تکلف سے کام لیا ہے یا نہیں۔ قاری دراصل مترجمہ متن کو ترجمے کے طور پر نہیں، اصل متن کے طور پر پڑھ رہا ہے۔ اسے اپنی زبان کا محاورہ اور ذائقہ چاہیے۔ اگر مترجم مصنوعی فضا بناءے گا یا مکھی پر مکھی مارے گا تو قاری مترجم کی خامی پکڑ لیتا ہے، مگر اس کے پاس ثبوت نہیں ہوتا۔

مترجم کے لیے ماخذی اور ہدفی زبانوں میں سے کم از کم ہدفی زبان میں بہتر استعداد کا مالک ہونا چاہیے، مگر نقاد کے لیے دونوں زبانوں میں بہتر استعداد کا حامل ہونا ناگزیر ہے، بصورت دیگر موازنہ کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اگر وہ ماخذی زبان کے محاورے سے اچھی طرح آگاہ نہیں تو وہ وہی غلطیاں کرءے گا جو بالعموم ایک مترجم کر سکتا ہے۔

صرف و نحو سے ہٹ کر بھی بہت سے ایسے پہلو ہیں جو ایک مبصر یا جائزہ کار کے نہیں بلکہ نقاد کے دائرے میں آتے ہیں۔ ادبی تنقید میں معنی کے مباحث میں منشائے مصنف کا بہت شور ہے۔ مترجم کے لیے لازم ہے کہ وہ منشائے مصنف تک پہنچنے کی پوری کوشش کرے۔ فکشن میں تو یہ قدرے آسان ہے، مگر شاعری میں ناممکن۔

مترجم کی مجبوری ہے کہ وہ معنی سے لبریز ایک شعر کے ایک آدھ پہلو کا ہی ترجمہ کر سکتا ہے۔ شاعر الفاظ کے انتخاب اور ان کی نشت و برخاست سے معنی کا نظام بناتا ہے، جن کا کوئی متبادل نہیں ہوتا، اس زبان میں رہتے ہوئے بھی نہیں ہوتا، کجا زبانِ غیر میں۔

نقاد کا سب سے پہلا کام تو متن کی نوعیت کو جاننا ہے۔ متن کے مطابق نقاد کے ٹولز بھی بدل جائیں گے۔ جس طرح مترجم بھی متن کی نوعیت کے مطابق مثلاً صحافتی، علمی، ادبی ترجمہ کرتا ہے، اسی طرح نقاد بھی متن کے مطابق اپنے وسائل بروئے کار لاتا ہے۔ حتیٰ کہ ادبی ترجمے میں بھی مترجم اور نقاد کو عوامی ادب/ پاپولر لٹریچر اور سنجیدہ ادب/آرٹسٹک یا ہائی لٹریچر ادب میں تفریق کرنا ہو گی۔ پاپولر ادب عموماً اکہرے معنی کا حامل ہوتا ہے۔ معنی کی ترسیل بآسانی ہو جاتی ہے اور اسلوب کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔ خاک اور خون اور کئی چاند تھے سرِ آسماں کے مترجم اور نقاد کو علیحدہ علیحدہ پیمانے درکار ہوں گے۔

ادبی ترجمے میں بڑا چیلنج ادبی جہات اور جمالیاتی قدروں کی منتقلی ہے۔ ادبی متن میں ہئیت اور اسلوب زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ادبی متن میں یہ سوال بہت اہم ہے کہ مصنف نے متن کس طرح پیش کیا، جبکہ غیر ادبی متن میں یہ اہم ہے کہ کیا متن پیش کیا گیا۔ ادبی متن میں اسلوب معنی کی توسیع ہے، خاص طور پر شاعری میں۔ شاعری میں بھی بیانیہ شاعری کی نسبت اس کا اطلاق غزل پر زیادہ ہوتا ہے۔ تشبیہ، استعارہ، ابہام، تکرارِ لفظی، قافیہ وغیرہ کا ایک غریب مترجم کہاں تک خیال رکھ سکتا ہے۔ غیر ادبی متن میں بہت سی چیزوں سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے، مگر ادبی متن میں اسلوب کے سارے وسائل اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ مترجم کا امتحان یہ ہے کہ وہ ان میں سے کتنے وسائل پر گرفت پا کر ایک دوسری زبان میں ڈھال پائے۔ مبنی بر معلومات متن میں تو مترجم معلومات کی منتقلی کر لیتا ہے مگر ادبی متن میں جمالیاتی تاثیر کو کس طرح منتقل کیا جائے۔ کیا مترجمہ متن کو پڑھ کر بھی قاری کم و بیش انھی کیفیات سے گزرے گا جن سے اصل متن کا قاری گزرتا ہے؟ نقاد کا بڑا وظیفہ یہ دیکھنا بھی ہے کہ جمالیاتی لحاظ سے مترجمہ متن کس حد تک کامیاب ہے؟

ترجمے کا عمل ممکنہ متبادل لفظ کی تلاش اور ممکنہ بہترین لفظ کے انتخاب سے شروع ہوتا ہے۔ لفظ کو تناظر سے نکال کر تنہا کر دیا جائے تو لغوی معنی ہمہ وقت دستیاب ہیں۔ مترجم کا مسئلہ تو متن میں موجود لفظ کے تناظر میں اس کا قریب ترین متبادل تک پہنچنا ہے۔ جملہ، پیرا گراف یا پورا متن ایک لفظ کا تناظر ہو سکتا ہے۔ گویا لفظ کے دو تناظر

ممکن ہیں: ایک فوری اور ایک بعید۔ نقاد کا کام اس لیے خاصا دشوار ہے کہ اسے ترجمے کی تعیین قدر کے لیے دونوں تناظر ذہن میں رکھنے ہوں گے۔

کسی ادبی متن خصوصاً فکشن کے ترجمے میں مجموعی تاثر کو بھی بہت اہمیت ہے۔ معنی صرف الفاظ میں نہیں۔ مترجم کی مجبوری ہے کہ اس کے سامنے تو مرئی الفاظ ہی ہیں۔ اس کا کمال غیر مرئی فضا تک پہنچنا بھی ہے، مثلاً اصل متن میں ایک کردار کے بارے میں ہمارا کوئی بھی تاثر قائم ہوتا ہے، تو کیا ایسا ہی مترجمہ متن پڑھ کر بھی قائم رہتا ہے؟ نقاد کو یہ بھی دیکھنا ہے۔

پرانے/قدیم متون کے تراجم میں مترجم اور نقاد دونوں کو یہ دیکھنا ہے کہ کیا اصل متن کے دور کو زندہ دکھانا ہے یا نہیں۔ دیانت داری کا تقاضا تو یہی ہے کہ ماحول، ثقافت اور تہذیب سمیت پورے معنی منتقل کیا جائیں۔ تاہم یہ طے کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ کسی سینکڑوں برس پرانے متن کو جدید ماحول میں پیش کرنا ہے۔ نقاد کو مترجم کے اس فیصلے کا احترام کرنا ہوگا، کیوں کہ ترجمے کا ایک ہدف پرانے متون کو نئے قارئین کے لیے قابلِ فہم بنانا بھی ہو سکتا ہے۔ نقاد کو مترجم کو یہ آزادی دینا ہوگی کہ وہ ترجمے کی ضرورت و اہمیت کے مطابق اس میں زمان و مکان کی تبدیلیاں کر سکے، مثلاً شیکسپیئر کے کسی ڈرامے کو مقامی سیٹنگ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ کرشن چندر نے وٹینگ فار گوڈو کا ترجمہ ہندوستانی سیٹنگ میں کیا۔ ایک ہی متن کو مختلف طرح کے قاری کو ذہن میں رکھ کر ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ نقاد کے لیے 'حقیقی' قاری بہر حال وہی ہے جو مترجم کے ذہن میں ہے یعنی مترجم اور نقاد دونوں کے پاس ایک ہی بنیاد ہونی چاہیے۔ نقاد کے لیے آسانی ہو جائے گی اگر مترجم اپنے ترجمے کے عمل کے بارے میں چند ضروری وضاحتیں پیش کر دے۔

لفظی، جملے اور گرامر کی غلطیوں کی نشان دہی اور ذاتی تاثرات دینے کے علاوہ ایک جائزہ کار کے لیے یقیناً کچھ معروضی اصول بھی ہیں۔ اگرچہ ترجمے کے نقاد کا بنیادی وظیفہ خامیوں یا کمیوں کی نشان دہی یا ہلکی پھلکی اصلاح کرنا ہے، لیکن اگر وہ ایک قدم آگے جا کر متبادل ترجمہ بھی دے تو یہ سونے پر سہاگے کا کام ہوگا۔ نقاد اس چیز کا بھی جائزہ لے سکتا ہے کہ مترجم نے کوئی غلطی کیوں یا کس طرح کی۔ کیا وہ غلطی کسی مخصوص علاقے یا خطے کے رہنے والے کرتے ہیں؟ مثال کے طور پر انگریزی میں ایک اصطلاح انڈین ازم مستعمل ہے جس کا معنی یہ ہے کہ زبان و بیان کی ایسی غلطیاں جو صرف برِ صغیر کے لوگوں سے منسوب ہیں، جیسے 'نوٹ بک' کی بجائے 'کاپی' کا لفظ برتنا۔

لہذا ہمارے پس منظر میں مترجم سے ایسی کوتاہیوں کا احتمال رہتا ہے۔ اسی طرح اگر ماخذی زبان کے روزمرہ اور محاورے پر گرفت کمزور ہو تو فحش غلطیوں کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔

مترجم کی جلد بازی یا تساہل حیثی بھی ترجمے کا معیار گرا دیتی ہے۔ ایسا عموماً وہاں دیکھنے کو ملتا ہے جہاں مترجم بہ امر مجبوری یا کم معاوضے پر کام کر رہا ہو اور متن کے انتخاب میں بھی اس کا حصہ نہ ہو۔ ترجمہ کرنا ایک ذاتی معاملہ جیسی شے ہے۔ آخر ایک مترجم کسی مخصوص متن کا ترجمہ کرنے جیسے مشکل کام کا انتخاب کیوں کرے۔ اس کے پیچھے ذوق کارفرما ہونا چاہیے یا مشنری جذبہ۔ اس کا اطلاق خاص طور پر ادبی اور مذہبی نوعیت کے متون پر ہوتا ہے۔

نقاد کو اس طرف بھی دھیان دینا چاہیے کہ کہاں مترجم کی آنکھ نے دھوکا دیا اور وہ 'دعا' کو دغا' پڑھتا رہا۔ اسی طرح مترجم اصطلاحات میں مغالطے میں پڑ سکتا ہے۔ کسی خاص متن میں دوسرے شعبے کی اصطلاح کا استعمال ہو سکتا ہے جو مترجم کے لیے غیر معروف ہو اور وہ اسے سمجھنے کی زحمت بھی نہ کرے۔

کسی اہم کتاب کا ترجمہ، خاص طور پر اولین، ہدفی زبان میں بطور اصل کتاب کے ہی دیکھا جاتا ہے۔ تبصروں میں عموماً یہ بات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ ترجمے کی اپنی اصل سے کیا نسبت ہے۔ خاص طور پر ہمارے ہاں مترجمہ ادبی متون کو بطور اصل متن پیش کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسی 'چالاکی' عموماً ناشرین کی طرف سے دیکھنے میں آتی ہے، جہاں بعض اوقات مترجم کا نام ہی نہیں ہوتا یا پس منظر میں ہوتا ہے۔ اسی طرح عالمی کلاسیک یا زیادہ فروخت ہونے والی مترجمہ کتابوں کی تشہیر بطور اصل کتاب کی جاتی ہے۔

ترجمے کی جانچ کی اصول بندی پر پہلا باضابطہ کام جرمن خاتون Katharina Raiss کا ہے جو کتابی صورت میں 1971 میں شائع ہوا۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ 2000 میں Translation Criticism – The Potentials & Limitations کے نام سے شائع ہوا۔

محض ہدفی زبان تک محدود رہ کر بھی ترجمے کے بارے میں رائے قائم کی جا سکتی ہے اور اندازہ لگایا جا سکتا ہے مگر ماخذی متن سے وفاداری بھی تو مترجم پر لازم ہے، جس کا اندازہ صرف دونوں زبانوں کے موازنے سے ہی لگ سکتا ہے۔ تنقید کا آغاز متن کی قسم اور نوع کے تعین کے بعد ہونا چاہیے، جیسے پاپولر/عوامی اور سنجیدہ ناول کے تراجم کو ایک ہی پیمانے سے نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ اصولی طور پر نقاد کے پاس بنیادیں وہی ہونی چاہئیں جو مترجم کے پاس ہیں، اسی صورت میں وہ جانچ کا حق ادا کرنے کے قابل ہو گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مترجم بھی اپنے سارے

عمل کی وضاحت کرے کہ اس کا ہدفی قاری کون سا ہے اور اس نے کن امور کا خیال رکھا ہے اور اسے کن کن مشکلات سے گزرنا پڑا اور ان سے کیسے نبٹا، وغیرہم۔

کیتھرینہ لکھتی ہیں:

> Just as the translator must realize what kind of text he is translating before he begins working with it, the critic must also be clear as to the kind of text represented by the original if he is to avoid using inappropriate standards to judge the translation. (2)

متن کی بنیاد لفظ پر ہے، لہذا یہ طے کرنا ضروری ہے کہ زبان سے کیا کام لینا مقصود ہے۔ متن کا مشکل یا آسان ہونا ایک اضافی امر ہے۔ اس طرح کی درجہ بندی کے کوئی عالمی اصول نہیں ہیں۔ ترجمے کی قسم، نوع اور قاری کے اعتبار سے تقاضے بدل جائیں گے، مثلاً قانونی ترجمے میں لفظ کی روح کے ساتھ اس کا متبادل لفظ بھی اتنا ہی اہم ہے۔ زبان بیک وقت کئی سطحوں پر کام کر رہی ہوتی ہے:

> Language serves simultaneously to represent (objectively), express (subjectively) and appeal (persuasively). (3)

ظاہر ہے کہ ہر طرح کے متن میں ان تینوں عناصر کا اظہار یکساں نہیں ہوتا۔ اس لیے مترجم اور نقاد دونوں کے پیمانے نہ صرف قسم اور نوع کے اعتبار سے بدلیں گے بلکہ ایک سطح پر ہر متن کی اپنی انفرادیت کے مطابق بھی تھوڑا بہت بدلیں گے۔ مواد، ہیئت اور مقصد کے اعتبار سے متون کو باآسانی تقسیم کیا جا سکتا ہے اور مختلف عنوانات کے تحت ان کی تقسیم کی بھی گئی ہے۔ ادبی، علمی، سائینسی اور صحافتی متون کی بات اردو دنیا میں عام ہے۔ ان کے علاوہ مذہبی، دفتری اور کاروباری متون کی بات بھی کی جاتی ہے۔ کیتھرینا متن کو درج ذیل اقسام میں تقسیم کرتی ہیں:

۱۔ Content-focused text مواد مرکوز متن
۲۔ Form-focused text ہیئت مرکوز متن
۳۔ Appeal-focused text تاثر مرکوز متن
۴۔ Audio-medial text آڈیو میڈیائی متن

پہلے تین زمروں کا تعلق تحریری متن سے ہے، جبکہ چوتھا زمرہ ایک پیچیدہ متن ہے، جس میں تحریر کے ساتھ دیگر عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ ترجمے کے زاویے سے متن کو مختلف زمروں میں تقسیم کرنے کے بعد ان کے ذیلی زمرے بھی سامنے آئیں گے۔ اگر متن کی قسم (type) کا تعلق بنیادی طور پر ترجمے کے طریقہ کار اور اس بات سے ہے کہ ہدفی متن میں کیا کچھ محفوظ کرنا ہے تو متن کی نوع (kind) کا تعلق لسانیاتی عناصر سے ہے جن کو دورانِ ترجمہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ مواد مرکوز متن قسم میں متن کو درج ذیل انواع میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: بشری علوم، فطری سائنس، تکنیکی علوم، پریس ریلیز، خبریں، دستاویزات، تعلیمی نوعیت کی چیزیں، غیر افسانوی مواد، کاروباری مراسلت، مضامین، رپورٹیں، مقالات، دفتری مراسلت، وغیرہ۔

مواد مرکوز متن اور ہیئت مرکوز متن کی تقسیم بھی ذرا غیر واضح ہے کیونکہ ہر مواد بہر حال کسی نہ کسی ہیئت میں ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مواد ہیئت کی نوعیت کو بدل سکتا ہے تو ہیئت مواد پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ زبان محض معلومات/پیغام کے ابلاغ کا ذریعہ نہیں۔ یہ ایک تہہ دار سرگرمی ہے۔ خاص طور پر تاثر مرکوز متن میں تو ایسا ہرگز نہیں، جس میں زبان کے مختلف وسائل برتنے کی وجہ سے قاری کے ذہن پر تاثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہاں معلومات یا پیغام ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ مواد مرکوز متن کا مطمح نظر موثر ابلاغ اور معلومات کی درست منتقلی سے ہے تو ہیئت مرکوز متن کا سروکار جمالیات اور فن سے ہے۔ مواد مرکوز متن کی جانچ اگر صرف و نحو اور قواعد کی روشنی میں ہو سکتی ہے تو ہیئت مرکوز مواد کی جانچ صرف و نحو کے علاوہ جمالیاتی اور اسلوبیاتی پیمانوں سے بھی ہو گی۔ اگرچہ ہدفی متن میں ایسی جانچ کرنا آسان نہیں۔ مواد مرکوز متن کے ترجمے کے نقاد کو صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا ہدفی متن میں مواد اور معلومات کی ترسیل ہوئی ہے یا نہیں۔ ایسے ہدفی متن میں کسی حد تک ہیئت کا خیال رکھے جانا بھی ضروری نہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ایک سطح پر ایسے متن میں ماخذی زبان کی نسبت ہدفی زبان کی حرکیات زیادہ اہم بن جاتی ہیں۔ اس ضمن میں کیتھرینا لکھتی ہیں:

> The target language must dominate, because in this type of text the informational content is most important, and the reader of the translation needs to have it presented in a familiar linguistic form. (4)

ہیئت مرکوز متن:

ہیئت کی سادہ ترین تعریف یہی کی جاسکتی ہے کہ 'جو کچھ' مصنف نے 'جس انداز' میں کہا ہے وہ انداز ہیئت ہے۔ مواد اگر 'کیا' سے متعلق ہے تو ہیئت 'کیسے' سے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ مواد اور ہیئت کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہیئت مرکوز والے مواد میں مصنف شعوری یا لاشعوری طور پر ہیئت کا پابند ہو جاتا ہے، جو جمالیاتی تاثر پیدا کرتا ہے۔ اس پر باقاعدہ تحقیق کی جاسکتی ہے کہ ہیئت کس طرح مواد کے موضوع کو متاثر کرتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ہیئت علیحدہ سے ایک تاثر پیدا کرتی ہے اور تاثر بھی معنی کی ہی توسیع ہے۔ ایسے متون کا اعلیٰ ترین ترجمہ وہی ہو سکتا ہے جس میں ماخذی متن کی ہیئت بھی اختیار کی گئی ہو۔ ایسے متون، خاص طور پر شعری، کی کامیاب ترین مثالوں میں اسیر عابد کے پنجابی میں دیوانِ غالب کے ترجمے کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس ترجمے میں مترجم کو بہر حال یہ آسانی ہے کہ ماخذی اور ہدفی زبانیں ایک دوسرے کے بے حد قریب ہیں۔ اس طرح کے تراجم میں معنی کی پرتوں کی حد تک برابری کی توقع کی جاسکتی ہے۔

شاعری میں صوت اور آہنگ کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ مواد اور معنی سے قطع نظر رائم سکیم یا اردو غزل میں ردیف و قافیہ کی اپنی اہمیت ہے۔ نثر میں بھی بعض الفاظ یا حروف کی تکرار یا کسی مخصوص لفظ کا استعمال ایک خاص تاثر پیدا کرتے ہیں، جن کو ایک ماہر مترجم ہی مدِ نظر رکھ سکتا ہے۔ خاص طور پر صاحبِ اسلوب ادیبوں کے ہاں یہ چیز ملے گی، مثلاً مشتاق احمد یوسفی ایک جگہ لکھتے ہیں: 'چورا ہے بلکہ شش و پنج را ہے۔' وہ ایسی تراکیب گھڑتے ہیں جن کے معنی صرف اس جملے میں ہی زیادہ معنی خیز ہوتے ہیں۔ محاورات، ضرب الامثال اور تراکیب میں کسی بھی زبان کی دانش کے ساتھ ساتھ زبان کی نزاکتیں اور باریکیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ یہاں بعض اوقات مترجم بے بس ہو جاتا ہے اور بعض اوقات وہ ہدفی زبان سے مقابلے کی شے لے آتا ہے۔ سوال یہی ہے کہ ایسی صورتوں میں مترجم سے کیا توقع رکھی جائے؟ ہر زبان کی اپنا صوتی نظام اور آہنگ ہے۔ معنی و مفہوم کے علاوہ ان 'آرائیشی عناصر' کی ہدفی زبان میں منتقلی، خواہ جزوی، ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ اصول کے درجے میں تو ایسا ہونا چاہیے، مگر اسے انسانی نارسائی ہی کہا جاسکتا ہے کہ کامل درجے میں ایسا ہونا محال ہے، لہذا نقاد کو بھی بہت توقعات نہیں باندھنی چاہییں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہیئت مرکوز متن میں مترجم ان سے پیچھا بھی نہیں چھڑا سکتا۔ یہاں مترجم کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ ہدفی زبان کے مزاج کے اعتبار سے ہیئت میں تبدیلی لے آئے۔ مثال کے طور پر سانیٹ کا ترجمہ اردو نظم یا غزل کی صورت میں کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ شعری متن کا ترجمہ شعری متن میں ہی ہو تو افضل ہے تاکہ ہدفی زبان کے قاری یا سامع پر ملتے جلتے اثرات مرتب ہوں۔

اگرچہ شاعری کے مقابلے میں فکشن میں ہیئت اور آرائشی عناصر کے جھنجھٹ بہت کم ہوتے ہیں، مگر پھر بھی مترجم کو قدم قدم پر جمالیاتی عناصر کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ تاہم ایسا ہر طرح کے فکشن کے بارے میں درست نہیں، مثلاً ایک طرف پاپولر یا مقبولِ عام ناول ہے تو دوسری طرف سنجیدہ ناول۔ اگر اردو کی بات کریں تو ایک طرف نسیم حجازی اور رضیہ بٹ کے ناول ہیں تو دوسری طرف قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین کے ناول۔ مقبول عام فکشن کو بہت حد تک مواد مرکوز متن کے ذمرے میں رکھنا ہو گا کیونکہ ان میں جمالیاتی عناصر کی منتقلی کے بجاے مرکزی پلاٹ یا معلومات کی منتقلی اہم ہے۔ ناول یا افسانے میں جس قدر تہہ داری ہو گی مترجم کی ذمہ داری اسی قدر بڑھ جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس تہہ داری کا ذریعہ زبان ہے۔

سپاٹ اور اکہرے معنی کی حامل شاعری یا عمومی طور پر بیانیہ/رزمیہ/لوک/زبانی روایت کی شاعری کو مواد مرکوز متن شمار کرنا ہو گا۔ نثر کی ایک بڑی صفت اس کے اکہرے معنی کا حامل ہونا ہے۔ اگر یہی صفت شاعری میں پائی جاتی ہے تو مترجم اور نقاد اس صفت کو مدِ نظر رکھیں گے۔ کسی حد تک یہی بات نظریاتی شاعری کی بابت بھی کی جاسکتی ہے۔ کسی بھی نوعیت کی نظریاتی شاعری میں معلومات یا پیغام بہت اہم ہوتا ہے۔ ایسا کم ہی ہوا کہ ایسی شاعری فنی اور جمالیاتی اعتبار سے بھی بہت پختہ ہو۔ اردو شاعری میں اس کی اعلیٰ مثال علامہ محمد اقبال کی کہی جاتی ہے۔ شاعری میں اہم شے علامتی نظام اور تہہ داری ہے۔ فیض ہی کی دو نظموں کو مختلف ذمروں میں رکھنا چاہیے۔ 'تنہائی' اگر ہیئت مرکوز متن کی مثال ہے تو 'و یبقی فی ربک' مواد مرکوز متن کی۔ اکہرے معنی کی حامل شاعری میں معلومات یا پیغام حاوی رہتا ہے۔ ایسے متن کے ترجمے کی کامیابی اس پیغام کی کامیاب منتقلی پر ہے، جبکہ محاورے، استعارے، تشبیہ یا علامت وغیرہ جیسے محاسن جو معنی میں تہہ داری کا باعث ہیں، کی منتقلی کارِ دیگر ہے۔ شعر کا کثیر المعنی ہونا ایک بڑی صفت گردانا جاتا ہے۔ کثیر المعنی ہونے کے سبب ہی اردو شعرا میں سب سے زیادہ شروح غالب کی ہیں۔ نثر میں الفاظ کے انتخاب اور جملے میں ان کے دروبست یا مقام سے عموماً کوئی فرق نہیں پڑتا، مگر شاعری میں کسی لفظ کی جگہ اس کا ہم معنی لفظ لانے اور لفظ کا مقام تبدیل کرنے سے، خواہ وزن کے مسائل نہ بھی پیدا ہوں، معنی میں تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔ پہلو دار شاعری کے ترجمے کا بڑا مسئلہ یہی ہے کہ مترجم صرف ایک آدھ پہلو کو مدِ نظر رکھ کر ترجمہ کر سکتا ہے۔ بڑی شاعری کے ایک معنی تو سامنے کے ہوتے ہیں۔ مترجم کی مشکل یہ ہے کہ آیا وہ سامنے کے معنی کو نظر انداز کرئے یا گہرے معنی کو۔ معنی وہی برآمد ہو سکتے ہیں جن کا اہتمام شاعر نے رکھ چھوڑا ہو۔ یوں شعری متن کے ترجمے میں مترجم کا ذوق، نظریہ اور نقطہ نظر بھی اہم ہو جاتا ہے۔ ناقد کی ذمہ داری اس نزاکت کو بھی سمجھنا ہے کیونکہ ضروری نہیں کہ مترجم محض سامنے کی بات ترجمے میں لائے۔ یہ علیحدہ بحث ہے کہ

مترجم کس طرح بعض اوقات شعری یا نثری متن میں اضافہ کرتا ہے، جو کسی بھی طرح ایک جائز عمل نہیں۔ ڈاکٹر محمد کامران اپنے مضمون میں غالب کے شعر:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

کے آٹھ انگریزی تراجم کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ یہاں صرف احمد علی کا ترجمہ پیش ہے:

The joy of every drop – is to merge into Sea
When pain accedes all bounds – it becomes its remedy.

ڈاکٹر صاحب ان تراجم کا عمدہ تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غالب کے کلام میں تصوف کے سدا بہار پھولوں کی مہک پائی جاتی ہے۔

مذکورہ شعر غالب کے متصوفانہ اندازِ فکر کی عکاسی کرتا ہے۔ غالب اگرچہ صوفی شاعر نہیں تھے مگر ان کے ہاں تصوف برائے شعر گفتن خوب است، والا معاملہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے احمد علی اور مجیب نے فنا کے لیے merge کا لفظ استعمال کیا ہے۔ گویا قطرے کا دریا میں ادغام اس کا اختتام نہیں دوام ہے۔ لیکن یوسف حسین نے فنا کا متبادل annihilation پیش کیا ہے۔ اموبند گیا پا دھیائے نے جو لغوی اعتبار سے تو موزوں ہیں مگر غالب کی انفرادیت پرست شخصیت کے پیش نظر merge کا استعمال زیادہ موزوں محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح احمد علی نے عشرت کا سادہ مفہوم joy استعمال کیا ہے۔ یوسف حسین نے delight اور Thomas Fitzsimons نے Ecstasy کا لفظ استعمال کیا ہے۔ امریکی شاعروں نے غالب کا ترجمہ کرتے ہوئے نہ تو تصوف کی روایت کو پیش نظر رکھا ہے نہ ہی غالب کی شخصیت اور برعظیم کے اجتمائی طرز احساس کو اہمیت دی ہے۔ اس لیے ان کے تراجم کی حیثیت بے جڑ کے پودے کی سی ہے۔" (5)

متن شعری ہو یا نثری اگر اس میں معنی و مفہوم/پیغام/معلومات کے علاوہ برتے گئے الفاظ مساوی یا زیادہ اہمیت کے حامل ہیں تو مترجم کو چاہیے کہ ہدفی زبان میں کسی نہ کسی حد تک ملتی جلتی فضا قائم کرے، بصورتِ دیگر ترجمہ کرنا ایک تکلف ہوگا۔ اسی نوعیت کا ایک شعر بطور مثال پیش ہے:

بتِ دل شکن یہ بنائے کن کے ہیں سحر کن تیرے گھنگرو
گیا سینہ چھَن گیا دل بھی چھِن جو نہی باجے چھُن تیرے گھنگرو

یہ لفظی کرتب ہے: کن، کن، کن، چھَن، چھِن، چھُن۔ تکرارِ الفاظ (alliteration) کی صورت میں مترجم کو کوشش کرنی چاہیے کہ تکرارِ الفاظ ہی لائے۔ نقاد کے ذہن میں رہے کہ اگر دونوں زبانوں کی ساخت مختلف ہے تو ماخذی زبان میں لفظوں سے کھیلنے والے عناصر کی تلاش کے امکان کم ہو جائیں گے، مثلاً عربی یا فارسی سے اردو ترجمے اور چینی یا انگریزی سے اردو ترجمے میں زبان کی نزاکتوں کو سنبھالنے میں بہت فرق ہے۔

اگر ہم اردو ادب میں بیسویں صدی سے مثال لیں تو ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں سے ادب نے گہرے اثرات قبول کیے۔ ترقی پسند فنکاروں نے 'پیغام' کو اولیت دی اور اسی لیے نظم اور افسانے کو ترجیح دی گئی۔ حلقہ اربابِ ذوق اور پھر جدیدیت سے متاثرہ ادب میں 'پیغام' اس قدر آسانی سے ہاتھ آنے والا نہیں تھا اور یہاں 'پیغام' اور اسلوب میں دوئی نہیں تھی۔ دونوں طرح کے متون سے نپٹنے کے لیے تقاضے مختلف ہیں، جو مترجم اور نقاد کے پیشِ نظر رہنے چاہئیں۔ مواد مرکوز متن میں ترجمے کی زبان پر ہدفی زبان کا غلبہ رہنا چاہیے اور ہیئت مرکوز متن میں ماخذی زبان کا۔

شعری متن کو نثری متن کی صورت میں ترجمہ کرنے کو فنِ ترجمہ کے ماہرین 'ترجمہ' شمار نہیں کرتے۔ ایسے متن کو ماخوذ یا adaptation کہا جا سکتا ہے۔ اردو میں اس کی ایک اچھی مثال 'جہاں گرد کی واپسی' از محمد سلیم الرحمن ہے جو ایلیڈ کا نثری روپ ہے۔ کسی حد تک یہ چیز ناول کی ڈرامائی یا فلمی تشکیل سے مماثل ہے۔

3۔ اپیل مرکوز متن: اس نوع کے متن میں اگرچہ مواد مرکوز متن کی طرح کی منتقلی اہم ہے مگر معلومات/پیغام بجائے خود اہم نہیں ہوتے، وہ ذریعہ ہیں قاری یا سامع میں کوئی مخصوص تاثر یا کیفیت پیدا کرنے کا۔ جس طرح فلم یا ڈرامے میں مکالمے کے علاوہ بہت سی آرائشی چیزیں ہوتی ہیں جو دیکھنے والے میں مخصوص کیفیت پیدا کرنے کے لیے ناگزیر ہوتی ہیں، خاص طور پر جب میلوڈرامیٹک صورت حال پیدا کرنی ہو۔ ایسے متن میں اولین اہمیت نہ مواد کو ہے اور نہ ہیئت کو، کیونکہ مقصد قاری یا سامع میں مخصوص ردِ عمل پیدا کرنا ہے، لہٰذا ایسے متن میں لفاظی کا بھی امکان ہوتا ہے۔ داستان، رزمیہ، جاسوسی، سنسنی خیز فکشن، مذہبی/تبلیغی مواد، اشتہارات جیسے متون اس ذیل میں آتے ہیں۔ ایسے متون کا ترجمہ کرتے ہوئے ہدفی زبان حاوی رہتی ہے۔ چونکہ معلومات سے زیادہ مخصوص تاثر پیدا

کرنا مقصود ہے، لہذا ہدفی زبان کے تمام امکانات بروے کار لائے جانے چاہیئں۔ ترجمے کو محض صرفی و نحوی اصولوں پر نہیں پرکھنا، مثلاً اکثر تشہیری مواد ہماری بعض جبلتوں اور جذبات سے کھیلتا ہے۔

> "Positive emotional appeal covers humor, love, happiness, etc, while negative emotional appeal involves fear, a sense of guilt, and so." (6)

اسی طرح ہر قسم کے پراپیگنڈہ لٹریچر کا شمار بھی اسی ذمرہ میں ہوگا۔ان سب طرح کے متون کے ترجمے میں یہی چیز غالب رہنی چاہیے کہ قاری/سامع/ناظر کے دل و دماغ پر وہی تاثرات مرتسم ہوں جن کا اہتمام ماخذی زبان میں رکھ چھوڑا ہے، کیوں کہ مقصد خاص نتائج کا حصول ہے۔اشتہار بازی میں مقامیت کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

اسی طرح ہر شاعری کو ہیئت مرکوز متن کے ذمرے میں نہیں رکھا جاسکتا، مثلاً مسدسِ حالی کا بڑا حصہ مواد مرکوز کے تحت رکھا جاسکتا ہے۔ذیل میں مسدس کے ابتدائی اشعار:

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا
کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

کے تراجم پیش ہیں:

> Someone went to Hippocrates and asked him 'In your opinion, which diseases are fatal?'
> He said, "There is no ailment in the world for which God has not created the medicine,
> 'Except for that disease which people think trifling, and about which whatever the physician says is nonsense. (7)
>
> .....
>
> To Buqrat someone went, to know
> Of fatal disease in his view.

Said: There isn't ailment in the world,
The cure of which God has not stirred.
And that disease which men say simple,
Oppose doctors, call it puzzle. (8)

کسے پچھیا جا بقراط کولوں
کہڑے روگ نے جان نوں مار دے جی
کہیا اوس نہیں ویکھیا روگ کوئی
بناں داروواں، وچ سنسار دے جی
پر اوہ روگ جو سہل بیمار سمجھن
کہے وید جو نہیں وچار دے جی(9)

تینوں تراجم میں پیغام بآسانی منتقل ہوا۔ کرسٹوفر شیکل ایسے شعری متن کے ترجمے میں سہولت کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

Linguistic adaptation of a quite different kind is involved in translation, as opposed to adaption. As a work with an urgent message conveyed in a straightforward style. Hali's Musaddas might appear ideal translation material.(10)

4۔ آڈیو میڈیائی متن (Audio-medial text)

ایسا متن نسبتاً پیچیدہ نوعیت کا ہے۔اس کی انفرادیت غیر لسانی یعنی (ٹیکنکل) میڈیا، گرافکس اور اظہار کے بہت سے بصری (visual) ذرائع پر انحصار پر ہے۔اس میں وہ متون شامل ہیں جن میں سامع تک ابلاغ کے لیے محض الفاظ ناکافی ہوں۔ان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے سکرپٹ، ڈرامے، فلمیں، سٹیج ڈرامے اور رپورٹیں وغیرہ شامل ہیں۔ان میں دیکھنے کے لیے بہت سامان ہوتا ہے۔ سیٹنگ، موسیقی، لباس، مناظر، حرکات و سکنات، رنگ، چہرے کے تاثرات، بولنے کا انداز وغیرہ ایک ایک بات اپنا اثر چھوڑ رہی ہوتی ہے۔ایسے متون میں بنیادی طور پر اپیل مرکوز متن اور مواد مرکوز متن دونوں کی صفات ہوتی ہیں۔ایسے متون کا ترجمہ کسی چیلنج سے کم نہیں۔ مجموعی طور پر اس میں اپیل کا عنصر حاوی رہتا ہے، اس لیے ہدفی زبان کا غلبہ ہونا چاہیے۔

فلم اور ڈرامے کے متن میں مصنف کی طرف سے 'ہدایات' نہایت اہم کردار ادا کرتی ہیں، جن کو نظر انداز کر کے بعض اوقات اصل متن بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ مترجم جو موقف متن کے بارے میں اپنائے گا وہ 'ہدایات' کو بھی متاثر کرے گا۔ 'ہدایات' کے ترجمے میں ہدفی زبان کا غلبہ رہنا بہتر ہو گا۔

مختصر یہ کہ ترجمے کی تنقید کے معروضی اصولوں اور ماخذی متن کو مدِ نظر رکھے بغیر ترجمے کے بارے میں کوئی رائے نہیں رکھی جا سکتی۔ وقت آ گیا ہے کہ اب محض سادہ تجزیے و تبصرے کرنے پر اکتفا کرنے کی بجائے ماخذی متن کی بنیاد پر ترجمے کی تنقید کو فروغ دیا جائے۔ ترجمے کے نقاد کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ ہدفی متن کے بارے میں مترجم کے نقطہ نظر اور اس کے ذہن میں ممکنہ قاری کے تصور سے آگاہ ہو۔ نقاد کو ماخذی متن اور مترجم دونوں کو اہمیت دینا ہو گی۔

## حوالہ جات


۱۔ محمد حسن عسکری، "گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے"، مشمولہ مجموعہ محمد حسن عسکری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۰۵

2. Katherina Reiss, Translation Criticism – The Potentials & Limitations Errol F. Rhodes, (translator) Routledge, New York, 2000 P. 16 .
3. ibid, p25
4. ibid, p 31

۵۔ ڈاکٹر محمد کامران، "کلاسیکی اردو شاعری کے انگریزی تراجم" مشمولہ بازیافت، لاہور، شمارہ 13۔ جولائی-دسمبر 2008، ص 182۔

6. (Lin, L. Y. (2011). "The impact of advertising appeals and advertising spokespersons on advertising attitudes and purchase intentions." African Journal of Business Management, 5(21), 8446-8457.)
7. "Hali's Musaddas: The Flow and Ebb of Islam", Christopher Shackle and Javed Majeed, Oxford University Press, Delhi, 1997, p 103
8. "Truth Unveiled." A. Rauf Luther, Sh. Mubarak Ali, Lahore, 1978, p 1

۹۔ "حالی دی مسدس (پنجابی ترجمہ)"، چوہدری سر شہاب الدین، دید شنید پبلی کیشنز، لاہور، 1995، ص 21

10. "The impact of Musaddas", Hali's Musaddas: The Flow and Ebb of Islam, Christopher Shackle and Javed Majeed, Oxford University Press, Delhi, 1997 p 45